پروفیسر محمد عثمان

جہاد کی حقیقت

جہاد کا لفظ جہد سے نکلا ہے اور لغت میں اس کے معنی محنت اور کوشش کے ہیں۔ اس اعتبار سے جہاد فی سبیل اللہ کے معنی راہِ حق میں جد وجہد اور سعیٔ بلیغ کرنے کے ہیں اور قرآن وسنت سے اس کی کم از کم چار قسمیں ثابت ہیں۔ (۱) نفس کی سرکش قوتوں کے خلاف جہاد جسے رسولِ اکرمؐ نے جہادِ اکبر سے تعبیر فرمایا ہے (۲) علم کے ساتھ جہاد جسے اصطلاحِ مذہبی میں جہاد بالقرآن کہتے ہیں اور قرآن نے اسے جہادِ کبیر بتایا ہے (۳) مال کے ساتھ جہاد جس کا مطلب راہِ حق میں زر و مال خرچ کرنا ہے اور قرآن حکیم میں اس پر جا بجا زور دیا گیا ہے (۴) جان کے ساتھ جہاد یعنی حق کی راہ میں جسمانی تکلیفیں اٹھانا اور جان کی پیش کش کرنا۔ قرآن اسے قتال فی سبیل اللہ، اللہ کی خاطر لڑنا اور جنگ کرنا کہتا ہے۔ اس تصریح سے واضح ہے کہ راہِ حق میں لڑنا جہاد کی فقط ایک صورت ہے مگر صدیوں سے اسی جنگ کے لیے جہاد کا وسیع تر اور جامع لفظ کچھ اس طرح سے مقبول اور رائج ہے کہ اب اس کا استعمال ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ زیرِ نظر مضمون میں اگرچہ بحث مطلق جہاد سے نہیں بلکہ محض قتال سے ہے مگر قارئین کی آسانی کے لیے لفظ ہر جگہ جہاد کا استعمال کیا گیا ہے۔

جہاد کی فرضیت اور جہاد کا قرآنی تصور اسلامی تعلیمات کا ایک ایسا روشن پہلو ہے کہ اس کے جاننے اور اس پر عمل پیرا ہونے میں کم سے کم وقت پیش آنی چاہیے تھی۔ مگر اس راہ میں اپنوں اور غیروں نے اس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں کہ اسے تاریخِ اسلام کا ایک المیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ دانستہ ٹھوکریں کھانے والوں سے قطع نظر جو لوگ خلوصِ نیت کے باوجود اس مسئلے کی حقیقت تک پہنچنے سے قاصر رہے ہیں، ان کی لغزشِ فہم کے دو اسباب تشخیص ہو سکتے ہیں: اوّل یہ کہ علمائے سلف نے اپنے مخصوص حالات کے پیشِ نظر اس باب میں جو اجتہاد کیا اور مسلمان کشور کشاؤں نے ملک گیری اور اشاعتِ توحید کے ملے جلے جذبات کے تحت جو راہِ عمل اختیار کی، بعد میں آنے والی نسلوں نے اپنی کوتاہ نظری کے باعث اس کو اسلام کا جزوِ لاینفک سمجھ لیا۔ دوم یہ کہ اس اہم مگر

شت کرنے سے اپنی محنت کی کمائی کی وہ رقم بچالے گا جو وہ زمیندار کو بٹائی کی صورت میں دیتا ہے۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ بٹائی کی رقم جو زمیندار مزارع سے وصول کرتا ہے وہ مزارع کی ہی محنت کا نتیجہ ہے۔ اور زمیندار کے واسطے وہ رقم اس کے سرمایہ پر سود کے سوا کچھ نہیں۔

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ زمیندار نے چونکہ زمین اپنی محنت کی کمائی سے خریدی ہے لہذا اس کو بٹائی لینے کا دوامی حق پہنچتا ہے ہم تجزیہ کر کے دیکھیں گے کہ اس کی کیا حقیقت ہے۔ فرض کیجیے ایک آدمی دس ہزار روپے اپنی محنت سے کماتا ہے۔ اور اس رقم کی زمین خرید کر بٹائی پر دیدیتا ہے۔ اور اس کو سالانہ سات سو روپے اوسطاً بٹائی سے وصول ہو جاتے ہیں اس طرح قریباً پندرہ سال کے عرصہ میں وہ اپنی زمین کی اصل لاگت وصول کر لیتا ہے۔ اور زمین مذکورہ جوں کی توں اس کی ملکیت ہے۔ دوسرے پندرہ سال میں زمیندار پھر دوبارہ اپنی زمین کی اصل لاگت وصول کر لیتا ہے۔ اور زمین پھر بھی جوں کی جوں اسی کی ہے۔ یہ عجیب سودا ہے۔ روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ بٹائی مذکورہ مزارع کی محنت کی کمائی ہے جو زمیندار کے اصل پر بطور سود اضافہ کر رہی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہوشیار لوگوں نے سیدھے سادے لوگوں کی محنت سے نفع اٹھانے کے مختلف مقامات پر مختلف نام رکھے ہوئے ہیں۔ ساہوکارہ کی صورت میں اس کا نام سود ہے اور مزارعت کی صورت میں بٹائی۔ بہرصورت وہ دوسروں کی کمائی ہے جو مفت خوروں کے پاس چلی آتی ہے ایک ہی چیز پر مختلف لیبل لگا دینے سے اس کی حقیقت اور ماہیت میں فرق نہیں پڑ سکتا۔ اگر سود حرام ہے تو بٹائی کیونکر حلال ہو سکتی ہے؟

کرایہ میں سود

مکانات اور دیگر اشیا کے کرایہ میں بھی سود کا عنصر صاف دکھائی دیتا ہے۔ کرایہ کی رقم میں سے سب قسم کے اخراجات مثلاً مرمت، گھسائی، بیمہ اور انتظامیہ اخراجات وغیرہ سب کچھ منہا کر لیجیے۔ باقی جو رقم بچتی ہے وہ اس سرمایہ کا سود ہوتا ہے جو کہ مکانات وغیرہ پر لگایا جاتا ہے۔ اس رقم کو سود شمار کرنے کے بغیر کوئی چارہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر اس کو سرمایہ کا سود نہ سمجھا جائے تو اور کیا تصور کیا جائے۔

(باقی آئندہ)

گیا۔ سرداران قریش کی مخالفت سخت سے سخت تر ہو گئی۔ پہلے صرف زبان سے کام لیا جاتا تھا، اب ہاتھ اٹھنے لگے۔ غریب اور کمزور مسلمانوں کو طرح طرح سے تنگ کیا جانے لگا۔ مسلمان غلاموں کو ان کے کافر آقا گرم ریت پر لٹا دیتے اور بہانے بہانے سے ان پر کوڑے برساتے تھے۔ اس تشدد کے باوجود مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ کفار کے غم و غصہ میں اور اضافہ ہو گیا۔ اب اٹھے ہوئے ہاتھوں میں تلوار کھنچ آئی۔ اور کچھ مسلمانوں کو جن میں ایک خاتون بھی شامل تھیں شہید کر دیا گیا۔ اس سے غرض عوام میں خوف و ہراس پھیلانا تھا تاکہ وہ انجام سے ڈر کر نئے دین میں داخل نہ ہوں۔ مگر رسول اکرمؐ اور آپ کے ساتھی ان مہیب مصائب کے درمیان کوہِ وقار اور پیکرِ عزم و استقلال بنے اپنی منزل کی طرف بڑھتے گئے۔ وہ بڑے سے بڑے دشمن کی بات بھی توجہ اور بردباری سے سنتے اور اپنی بات محبت اور نرمی سے اس کے دل میں اتارنے کی کوشش کرتے تھے۔ آں حضرتؐ کی دلی خواہش یہ تھی کہ مکہ کا ماحول ایسا ہو جائے کہ اس میں ہر شخص کو خیال اور عقیدے کی آزادی حاصل ہو۔ جو بت پرست رہنا چاہے وہ بت پرست رہے مگر جو خدا پرست بننا چاہے اس کو بھی ایسا کرنے کا حق حاصل ہو۔ مخالفین مسلمانوں کا یہ حق تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ وہ ہر شخص کو فقط بت پرست دیکھنا چاہتے تھے۔

ایک امن پسندانہ مگر انقلابی اقدام

توحید پرستوں پر مشقِ ستم جاری رہی۔ رسولِ اکرمؐ نے آبرومندانہ زندگی کی کوئی راہ نہ دیکھ کر ایک انقلابی مگر نہایت امن پسندانہ قدم اٹھایا۔ آپؐ نے کچھ مسلمانوں کو وطن چھوڑ کر ملکِ حبشہ چلے جانے اور وہاں بس جانے کا مشورہ دیا۔ اس تدبیر پر اس طرح عمل کیا گیا کہ کفار کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ مگر جب مسلمان یہ قدم اٹھا چکے۔ آزادیٔ عقیدہ و عبادت کے بنیادی انسانی حق کی خاطر پردیس کی زندگی اختیار کر چکے تو کفار نے وہاں سے بھی ان کو نکلوانے اور انہیں اپنی قید میں لینے کی ناپاک کوشش کی۔ اس کے بعد آں حضرتؐ اور آپ کے خاندان والوں کو ایک گھاٹی میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا گیا، اور سردارانِ قریش نے ان کے سامانِ خورد و نوش پر پہرے بٹھا دیے۔ یہ عہد لرزہ خیز اور دلدوز واقعات سے پُر ہے۔ مگر اڑھائی سال کے بعد جب یہ محاصرہ ختم ہوا تو بھی ماحول کی ناسازگاری اور سفاکی میں ذرہ بھر فرق نہ آیا تھا۔

اب ایک طرف جور و ستم کی اور دوسری طرف صبر و برداشت کی حد ہو چکی تھی۔ رسول اکرمؐ نے بالآخر وطن چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ کوئی معمولی فیصلہ نہ تھا۔ سینکڑوں مسلمانوں کو جن میں بوڑھے، جوان،

نازک مسئلہ کے متعلق قرآنی آیات کا مفہوم معین کرتے وقت ان کا تاریخی پس منظر یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ حالانکہ پس منظر کو سامنے رکھے بغیر ان آیات کا صحت کے ساتھ سمجھنا سمجھانا ایک امر محال ہے۔ لہٰذا میں سب سے پہلے اس پس منظر اور ماحول کو بیان کرتا ہوں جس میں ہم پر جہاد فرض کیا گیا۔

جہاد کی فرضیت کا پس منظر

رسول اکرمؐ نے جب مکہ کے لوگوں کو ایک خدا کی طرف بلایا اور انہیں بت پرستی سے منع کیا تو یہ دعوت ان کو بڑی ناگوار گزری۔ اوّل تو یہی بات ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ جس طریق زندگی کو ان کے باپ دادا نے برتا تھا اسے وہ کیونکر چھوڑ دیں۔ ایسا کرنا گویا اس امر کا اعتراف کرنا تھا کہ ان کے بزرگ گمراہ اور حقیقت سے بے بہرہ تھے، اور یہ صورت انہیں کسی طرح گوارا نہ تھی۔ دوسرے ان کے ہاں خاندانی اور قبائلی رقابتوں کا سلسلہ بڑی دور تک چلتا تھا اور ایک خاندان یا قبیلے کے لیے کسی دوسرے خاندان یا قبیلے کی سرداری قبول کر لینا ان کی فطرت کے سراسر خلاف تھا۔ اور رسول اکرمؐ کی دعوت میں انہیں آلِ ہاشم کی برتری کا خدشہ نظر آتا تھا۔ ان کی مخالفت کے بعض معاشی اور عمرانی اسباب بھی تھے۔ مثلاً رسول اکرمؐ کی تعلیم خدا کی وحدت اور انسانوں کی مساوات کا سبق دیتی تھی۔ انسان ہونے کی حیثیت سے امیر اور غریب، آقا اور غلام، قریش اور غیر قریش، مکی اور مدنی میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ اس سے مکہ کے متمول اور معزز گھرانوں کے احساسِ برتری کو ٹھیس لگتی رہتی تھی، اور ان کی خاندانی وجاہت کو صدمہ پہنچتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قریش کے سرداروں کو اس دعوت کی اوٹ سے معاشی بدحالی جھانکتی دکھائی دیتی تھی۔ کعبہ ملک کا سب سے بڑا بت کدہ تھا اور حج کے دنوں میں ہر سال زائرین ہزاروں کی تعداد میں مکہ کے کھلے میدانوں میں جمع ہوتے اور سال بھر کا اندوختہ ساتھ لاتے تھے۔ اس میں ایک حصہ تو خداؤں کی نظر ہو جاتا اور باقی سے وہ خرید و فروخت کرتے اور خوب دادِ عیش دیتے تھے۔ خداؤں کے متولی بھی قریش تھے اور بازاروں اور منڈیوں کے مالک بھی قریش۔ اس طرح بنانِ کعبہ کی بدولت ملک بھر کی دولت ہر سال ان کی جھولیوں میں پڑتی تھی۔ رسول اکرمؐ نے جب بت پرستی کے خلاف آواز اٹھائی تو دور اندیش قریش نے ایسا محسوس کیا جیسے ان کی عمارتِ تمول میں زلزلہ آ گیا ہو۔

ان چند در چند وجوہ کی بنا پر مکہ کے سرداروں نے شروع ہی سے رسولِ اکرمؐ کی دعوت سے اپنی بیزاری کا اظہار کر دیا تھا مگر جب آپؐ نے ان کی ناراضی کے باوجود حکمت و استقلال سے کام لیکر کچھ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا لیا تو مخالفین کی سرگرمیاں بھی تیز ہو گئیں۔ اب جوں جوں اسلام کا قدم آگے بڑھتا

اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ تم ان سے لڑائی جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے، اور دین صرف اللہ کے لیے ہو، ہاں اگر وہ جنگ سے رُک جائیں تو ظلم کرنے والوں کے سوا کسی پر سختی نہ ہونی چاہیے۔ حرمت والے مہینے کا عوض حرمت والا مہینہ ہے اور تمام حرمتوں کے بدلے ہیں۔ پس جو تم پر زیادتی کرے اس پر تم بھی اتنی ہی زیادتی کرو، اور اللہ سے ڈرو اور یاد رکھو کہ اللہ انہی کا ساتھی ہے جو اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔" (البقرہ : ۲۴)

یہاں بھی وہی پس منظر ہے۔ مسلمانوں کو ان لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو ان سے جنگ کرتے ہیں، اور ان کے ساتھ وہی سلوک کرنے کی ہدایت ہے جو وہ مسلمانوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ حکم ہوتا ہے ان کو ان گھروں سے نکال دیا جائے جہاں سے انہوں نے مسلمانوں کو نکالا تھا۔ اور اگر وہ حرمت کے مہینوں میں بھی لڑیں تو ان سے لڑائی جاری رکھی جائے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ انتباہ بھی ہے کہ زیادتی مت کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا لہٰذا اگر وہ لڑائی سے باز آجائیں تو مسلمانوں کو بھی جنگ بند کر دینی چاہیے اور جنگ کا مقصد یہ ہے کہ فتنہ پردازی باقی نہ رہے اور ملک میں امن و انصاف کی ایسی فضا قائم ہو جائے کہ جو شخص جو دین اختیار کرنا چاہے، اسے بے کھٹکے اختیار کر سکے۔ اکثر مفسرین نے یہاں فتنہ کے معنی دین سے برگشتہ کرنے کے لیے تشدد برتنا، اور اللہ کے لیے دین کے معنی مذہبی آزادی کے بیان کیے ہیں۔

کفار مکہ کے علاوہ رسولِ اکرمؐ کو مدینہ کے یہود اور عرب کے بعض دوسرے قبائل کے خلاف بھی جنگ کرنا پڑی، مگر ان جنگوں کی نوعیت بدر اور اُحد سے کچھ بھی مختلف نہ تھی۔ رسولِ اکرمؐ نے مدینہ پہنچتے ہی وہاں کے یہود سے اور آس پاس کے چند ممتاز عرب قبائل سے جو ہنوز دائرۂ اسلام سے باہر تھے دوستی کے معاہدے کیے۔ یہودیوں سے یہ طے پایا کہ اگر کوئی طاقت مدینہ پر حملہ آور ہو تو وہ رسولِ اکرمؐ کی قیادت میں شہر کی حفاظت کریں گے اور دشمن کی مدد نہ کریں گے۔ اسی طرح بعض قبائل سے جنگ کی صورت میں ایک دوسرے کی امداد کا معاہدہ کیا گیا۔ لیکن ہوا یہ کہ جہاں مسلمانوں نے ان معاہدوں کا سختی کے ساتھ احترام کیا وہاں مدینہ کے یہود اور بعض مشرک قبائل نے ان کی بار بار خلاف ورزی کی، اور عین جنگ کے موقعوں پر مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ کر دشمنوں کی اعانت کے مرتکب ہوئے۔ دشمن کے حلیف و مددگار

بچے اور عورتیں سب ہی شامل تھے اپنا گھر بار چھوڑ کر پردیس کی زندگی اختیار کرنا پڑی۔ لیکن وہ ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ کفار نے ان پر باعزت زندگی کی تمام راہیں بند کر دی تھیں اور یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ وہ کہتے تھے " خدائے واحد ہمارا رب ہے۔ ہم صرف اس کی عبادت کرتے ہیں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ ہم بت پرستی سے تائب و کنارہ کش ہیں۔"

لیکن مسلمانوں سے ان کا گھر بار چھڑوا کر بھی کفارِ مکہ کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ جب آنحضرتؐ مدینہ تشریف لے گئے اور وہاں آپؐ کا پُرجوش خیر مقدم کیا گیا تو سردارانِ مکہ کے دلوں میں حسد اور خدشات کی نئی آگ بھڑک اٹھی اور انہوں نے مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اوّلیں ارشادِ خداوندی بسلسلۂ جہاد

یہ تھا وہ پس منظر جس میں مسلمانوں کو پہلی بار لڑائی کی اجازت دی گئی اور ارشادِ خداوندی ہوا:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ (الحج ۳۹)

جن (مسلمانوں) سے لڑائی کی جاتی ہے ان کو بھی لڑنے کی اجازت ہے کیونکہ ان پر ظلم ہوا ہے اور اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے ہیں۔ ان کا قصور اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔

آپ نے دیکھا کہ اس آیتِ شریفہ میں وہ واقعات جو میں نے اوپر قدرے تفصیل سے بیان کیے ہیں مجمل طور پر درج ہیں۔ مسلمانوں کو لڑائی کی اجازت اس لیے دی جا رہی ہے کہ ان سے " لڑائی کی جاتی ہے " اور ان پر ظلم ہو چکا ہے۔ انہیں محض اس لیے جلاوطن کیا گیا ہے کہ انہوں نے بتوں کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ خدائے واحد کو اپنا پروردگار مانتے ہیں۔

اس اجازت اور اذن کی مزید وضاحت ہمیں مندرجہ ذیل آیات میں ملتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

" اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی مت کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ان کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ اور جہاں سے تم کو نکالا ہے وہاں سے تم ان کو نکال دو۔ اور دین کے لیے دکھ دینا قتل سے زیادہ سخت ہے اور جب تک کافر تم سے مسجدِ حرام کے پاس نہ لڑیں تم بھی ان سے اس جگہ مت لڑو۔ اور اگر تم سے لڑیں تو تم بھی ان کو قتل کرو۔ کافر ایسی کے سزاوار ہیں۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو

ہے۔ جہاد از خود عمل میں نہیں آتا۔ اس کی فرضیت اور اس کا جواز صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مسلمانوں کے انسانی حقوق غصب کیے جائیں یا کیے جانے والے ہوں۔ جب ان کے ساتھ ظلم و ناانصافی ہوئی ہو یا ان کے وجود و سالمیت کو کوئی خطرہ لاحق ہو۔ جب کوئی طاقت ان کی کو چیلنج کر رہی ہو۔

اس کے علاوہ فقط ایک صورت میں لڑنے یا قوت استعمال کرنے کی قرآنِ حکیم نے اور تلقین فرمائی ہے۔ اور اس کا تعلق مسلمانوں کی آپس کی صلح و جنگ سے ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔ پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو جو زیادتی کرتا ہے اس سے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے۔ پس جب وہ رجوع کرے تو ان دونوں میں برابری کے ساتھ صلح کرا دو اور تم انصاف کرو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔" (۴۹ : ۹)

مذکورۂ بالا آیت کا حوالہ دیتے ہوئے علامہ اقبال مرحوم اپنے ایک خط میں بڑی قطعیت کے ساتھ لکھتے ہیں:

"قرآن کی تعلیم کی رو سے جہاد یا جنگ کی صرف دو صورتیں ہیں۔ محافظانہ اور مصلحانہ۔ پہلی صورت میں یعنی اس صورت میں جب کہ مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور ان کو گھروں سے نکالا جائے مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت ہے (نہ حکم)۔ دوسری صورت جس میں جہاد کا حکم ہے ۴۹ : ۹ میں بیان ہوئی ہے۔ . . . . . جنگ کی مذکورۂ بالا دو صورتوں کے سوائے میں اور کسی جنگ کو نہیں جانتا۔ جوع الارض کی تسکین کے لیے جنگ کرنا دینِ اسلام میں حرام ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دین کی اشاعت کے لیے تلوار اٹھانا بھی حرام ہے۔" (اقبالنامہ حصہ اول - ۲۰۳ - ۲۰۴)

متذکرہ آیت (۴۹ : ۹) جیسا کہ آپ اوپر دیکھ آئے ہیں، دراصل مسلمانوں کے باہمی نزاع و اختلاف سے تعلق رکھتی ہے۔ اور اگرچہ اس میں زیادتی کرنے والے مومن گروہ کے خلاف طاقت استعمال کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے، تاہم یہ معاملہ خالصتاً مسلمانوں کا اندرونی مسئلہ ہے اور قرآن نے اسے قتال فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں لڑنے) کا نام دیا۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ آیت بھی جہاد کے کڑے اصطلاحی معنوں کی حدود سے خارج ہے۔ کیونکہ اساسی طور سے

کو دشمن قرار دینا ایک فطری امر ہے چنانچہ جیسے جیسے یہ عہد شکنی اور دغا بازی معرض عمل میں آتی گئی مسلمانوں کو ان بدعہدوں اور فریب کاروں کے خلاف بھی جنگ کرنے کا حکم دیا گیا۔ دراصل یہ لوگ اسلام دشمنی اور فتنہ انگیزی میں قریشِ مکہ سے کچھ کم نہ تھے۔ اور ہر اس جنگ میں شریک ہونے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے جس کی غرض اسلام کو نیست و نابود کرنا اور مسلمانوں کی ہستی کو فنا کرنا ہوتا تھا۔ اس بنا پر ان کے خلاف جہاد کی نوعیت قریب قریب وہی تھی جو کفارِ مکہ کے خلاف جہاد کی تھی۔ یعنی شر و فساد اور جنگی سرگرمیوں کا آغاز ان کی طرف سے ہوا اور مسلمانوں کی طرف سے جہاد اس کے جواب میں کیا گیا۔ یہی حال غزوۂ خیبر اور غزوۂ تبوک کا تھا۔ جب اس امر کی تصدیق ہو چکی کہ کوئی طاقت مدینہ پر حملے کی تیاریاں کر رہی ہے تو اس کے شر سے بچنے کے لیے آپؐ نے فوج کشی کا حکم دیا۔

جہاد ابدی اعلانِ جنگ نہیں ہے

کیا جہاد کا حکم کفار اور مشرکین کے خلاف ابدی اعلانِ جنگ نہیں ہے؟ اس سوال کا جواب قرآن حکیم نے خود بڑے اہتمام سے دیا ہے اور واشگاف لفظوں میں بتایا ہے کہ جنگ و قتال کا حکم مطلق اور ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ محض اور فقط ان لوگوں کے خلاف ہے جو مذہبی آزادی سلب کرنے کی کوشش کریں اور اختلافِ عقیدہ کی بنا پر مسلمانوں کے خلاف جارحانہ عزائم رکھتے ہوں مگر جو لوگ ایسا نہیں کرتے، مسلمانوں کی زندگی میں مخل نہیں ہوتے اور ان کی آزادی کے لیے خطرے کا موجب نہیں بنتے، ان کے ساتھ بلا امتیازِ عقیدہ و مسلک حسنِ سلوک کرنے اور پُرامن طریق سے رہنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اللہ تم کو ان کفار و مشرکین کے ساتھ مروت و احسان کرنے سے منع نہیں کرتا جو دین کے معاملے میں تم سے لڑے نہیں اور انہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ بے شک اللہ انصاف پسند لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔" (۶۰ : ۸)

ظلم و شر اور فتنہ و فساد کے خلاف جنگ ضروری ہے

قرآن حکیم میں جہاد کا حکم اور اس کے متعلقات کا بیان کئی جگہ پر ہے۔ ان سب کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو جو بات قطعی طور سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جہاد ایک ایسی جنگی کارروائی ہے جو فقط ظلم و شر، مکر و فریب اور فتنہ و فساد ہی کے جواب میں یا اس کے پیشِ نظر کی جا

کو تاکید فرمادی کہ جان و مال کے نقصان کی تلافی جاہلیت کے زمانے سے کہیں فراخدلی سے کی جائے۔

حضرت علیؓ نے فراخدلی کے ساتھ دیت اور اموال کا تاوان ادا کیا اور ادا ئے دیت کے بعد جو رقم بچی وہ احتیاطاً انہیں عطا فرمادی تاکہ اگر کسی اور قسم کے ضیاع کا انکشاف ہو تو اس کی بھی تلافی ہو جائے۔" (اردو ترجمہ حیاتِ محمدؐ، ص ۹۰۲)

جہاد ایک اصولی جنگ ہے

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن و سنت کی روشنی میں جہاد ایک ایسی اصولی جنگ ہے جس کے جواز کو دنیا کا کوئی انسان چیلنج نہیں کر سکتا، جو زندگی کے تحفظ، عقیدہ وخیال کی آزادی اور شر و فساد کی روک تھام کے لیے لڑی جاتی ہے تو پھر صدیوں سے غیر مذاہب والے کیوں جہاد کا نام لے لے کر مسلمانوں کو ایک خونخوار قوم اور اسلام کو ایک وحشی مذہب سمجھتے اور قرار دیتے چلے آرہے ہیں؟ اس کی دو وجوہ ہیں جن کا ہم نے مضمون کے شروع میں مختصراً ذکر کیا تھا اور اب ان کو قدرے تفصیل سے بیان کرنے کا مناسب موقع ہے۔

جیسا کہ آپ دیکھ آئے ہیں رسول اکرمؐ نے کم و بیش چودہ پندرہ برس تک انتہائی شدائد کے درمیان اشاعتِ توحید کا فریضہ انجام دیا اور جب ایک بستی (مدینہ) اسلام کا گھر قرار پا چکی اور اس میں بسنے والوں کی بھاری اکثریت نے بخوشی اسلام قبول کر کے اپنی زندگی و موت کو اس کے ساتھ وابستہ کر دیا اور تب بھی کفار اپنے جارحانہ عزائم سے باز نہ آئے تو پھر مسلمانوں کو اپنی زندگی کی حفاظت میں پہلے جنگ (جہاد) کی اجازت اور پھر اس کا حکم دیا گیا اور ظلم و زیادتی کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرنے کی بجائے قوت کے ساتھ اس کا جواب دینے کا اصول مسلمانوں کی زندگی کا ضابطہ قرار پایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اب اسلام محض ایک عقیدہ اور ایک نظریۂ حیات نہیں رہا تھا بلکہ مسلمانوں کی اپنی ایک مملکت (STATE) قائم ہو چکی تھی اور جس طرح ہر مملکت کا یہ فطری حق ہے کہ اپنی حفاظت کرے اور اپنی بقا و حیات کے لیے دشمن طاقتوں سے لڑے۔ اسی طرح نئی اسلامی مملکت کو بھی ہر لحاظ سے یہ حق پہنچتا تھا۔ لہٰذا قدرتی طور پر قیامِ مملکت کے بعد جس کسی نے بھی اس مملکت کی تباہی کا ناپاک ارادہ باندھا مسلمانوں نے اس کا جواب دیا کبھی حدودِ مملکت کے اندر (جنگِ احزاب) کبھی مملکت سے باہر نکل کر (غزواتِ بدر و اُحد) اور کبھی دشمن کے علاقے پر پیش قدمی کر کے (جنگِ تبوک)

جہاد غیر مسلموں کے خلاف جنگی کارروائی کا نام ہے اور قرآن حکیم نے ہر جگہ کفار و مشرکین ہی کی نسبت سے اسے بیان کیا ہے۔

جہاد اور سنت رسولؐ

قرآنِ حکیم کے بعد سنت رسول اللہؐ کا مطالعہ کیجیے۔ یہاں بھی یہ امر قطعی طور سے ثابت ہے کہ جہاد فقط آمادۂ شر و تشدد کفار و مشرکین کے خلاف ہی کیا گیا۔ کسی امن پسند قبیلے کے خلاف خواہ اس کا عقیدہ و مسلک کچھ ہی تھا جہاد کرنے کا سوال کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس ضمن میں حضرت خالدؓ بن ولید سے جو ایک مرتبہ چوک ہوئی اس کا ذکر اور اس پر رسول اکرمؐ کا اظہارِ ناراضی و بے تعلقی احادیث کی کتابوں میں بہ تفصیل موجود ہے۔ مولانا شبلی اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فتح مکہ کے بعد جب آں حضرتؐ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو بنو قذیمہ کی طرف بھیجا تو صاف فرما دیا کہ صرف دعوتِ اسلام مقصود ہے، لڑائی مقصود نہیں۔ چنانچہ ابن سعد لکھتے ہیں:

(ترجمہ) آنحضرتؐ نے خالدؓ کو بنو قذیمہ کی طرف بھیجا، دعوتِ اسلام کے لیے نہ کہ لڑائی کے لیے۔ علامہ طبری اس موقع پر لکھتے ہیں: (ترجمہ) آں حضرتؐ نے مکہ کے اطراف میں سراپا بھیجے دعوتِ اسلام کے لیے اور ان کو لڑائی کا حکم نہیں دیا۔

باوجود اس کے حضرت خالدؓ نے تلوار سے کام لیا اور آنحضرتؐ نے سنا تو آپؐ کھڑے ہو گئے اور قبلہ رو ہو کر کہا: اے خدا! خالد نے جو کچھ کیا میں اس سے بری ہوں۔ تین دفعہ اسی طرح یہ الفاظ فرمائے۔ پھر حضرت علیؓ کو بھیجا جنہوں نے ایک ایک بچہ کا یہاں تک کہ کتوں تک کا خوں بہا ادا کیا اور اس پر مزید رقم دی۔" (سیرت النبی حصہ اول، ص ۶۰۵)

مصر کے سابق وزیر تعلیم اور مشہور عالم محمد حسین ہیکل اپنی شہرۂ آفاق کتاب "حیاتِ محمدؐ" میں اس واقعہ کے ضمن میں حضرت خالدؓ کی بے جا شکر کشی کا بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"رسول اللہؐ نے سنا تو فرطِ غم سے بے قرار ہو گئے اور دونوں ہاتھ پھیلا کر حضور خداوندی میں التجا کی:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَبْرَاءُ مِنْ مَا صَنَعَ خَالِدُ بْنُ وَلِیْد (یا اللہ! خالد بن ولید کی اس حرکت سے میں بری الذمہ ہوں) اور حضرت علیؓ کو بہت سا مال و زر دے کر مقتولین کی طرف بھیجا تاکہ ان کی تعداد کے مطابق دیت (یعنی خون بہا) ادا کی جائے اور جناب علیؓ

اسلام پھیلانے کی کوشش قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن یہ خلوصِ نیت اور اصول پسندی زیادہ دیر تک باقی نہ رہی ۔ خلافت نے باقاعدہ بادشاہت کا رنگ اختیار کر لیا تو بادشاہت کا مزاج اور شہنشاہیت کی نفسیات کھل کھیلنے لگی۔ جب قوت حاصل ہو اور حدود سے تجاوز کرنے میں بظاہر کوئی امر مانع نہ ہو تو پھر بہت کم افراد اور قومیں ہوا و ہوس کے جذبات پر قابو رکھ سکتی ہیں۔ شہنشاہیت نے جہاد کی نوعیت بھی بدل دی۔ پہلے اسلام کی خاطر مملکت قائم ہوئی تھی اور اب مملکت کی خاطر اسلام قائم کیا جانے لگا اور اس مقدس نام کے استحصال (EXPLOITATION) کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ کسی غیر مسلم ملک پر چڑھ دوڑنے اور پُرامن بستی کو تاراج کرنے کا نام بھی جہاد قرار دیا جانے لگا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اسلام کا یہ رکنِ رکین مذہبی اور سیاسی عصبیت کا ایک نشان بن گیا۔

تصورِ جہاد کے بگڑ جانے کی ایک وجہ سیاسی تھی اور دوسری علمی۔ خلفائے راشدینؓ کے سامنے فقط قرآنِ حکیم تھا یا پھر رسول اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ۔ لیکن اموی اور عباسی ادوار کے عصری تقاضوں نے جو علوم ایجاد کیے ان کی بدولت علامہ اقبال مرحوم کے الفاظ میں :

حقیقت خرافات میں کھو گئی　　یہ امت روایات میں کھو گئی

خلافتِ راشدہ میں مسلمانوں کے پاس سوائے قرآن کے کچھ نہ تھا۔ لیکن عباسیوں کے عہدِ آخر تک یہ حالت ہو گئی کہ ان کے پاس سوائے قرآن کے اور سب کچھ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پس منظر ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا جس کو سامنے رکھے بغیر تصورِ جہاد پر سے بادشاہت اور ہوسِ ملک گیری کے پردے اٹھانا ممکن نہ تھا اور انجام کار اس کی وجہ سے مسلمانوں کو عظیم نقصانات اٹھانا پڑے۔

اسلام اور عدل و احسان

مصنفہ رئیس احمد جعفری

اس کتاب کا مقصد اسلامی تعلیمات کے ایک ایسے پہلو کو اجاگر کرنا ہے جو قومی تعمیر اور معاشرتی اصلاح کے لیے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ قرآن میں عدل و احسان کے بارے میں کیا وارد ہوا ہے۔ مفسرین کے اقوال کیا ہیں۔ احادیث نبوی سے عدل و احسان کے بارے میں کیا معلوم ہوتا ہے۔ فقہا نے عدل و احسان کو کیا حیثیت دی ہے اور اپنی تاریخ کے مختلف زمانوں میں مسلمانوں نے عدل و احسان کو کہاں تک اپنایا ہے۔ ان تمام مباحث پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۵۰ ، ۶ روپے

ملنے کا پتہ: سیکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور